بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44)

قرآن کا سیاسی نظام

پرویز

باب اول ----- انسان نے کیا سوچا؟

حاکم و محکوم کی کشمکش

جب انسانوں نے مل جل کر رہنا شروع کیا تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اس ٹکراؤ سے باہمی تنازعات پیدا ہوئے۔ اس سے اس ضرورت کا احساس بیدار ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے یہ ٹکراؤ پیدا نہ ہو اور اگر ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو باہمی کشمکش اور تنازعات کا فیصلہ عمدگی سے ہو جائے تاکہ معاشرہ فساد اور جنگ و جدل سے محفوظ رہے۔ اس سے نظام سیاست کے تصور کی ابتداء ہوئی۔ ابتدا ہوئی تو اس ضرورت کے ماتحت، لیکن جن لوگوں نے جھگڑے نپٹانے اور فیصلے کرانے کا کام اپنے ذمہ لیا، انہوں نے محسوس کیا کہ دوسروں سے اپنا حکم منوانے میں بڑی لذت ملتی ہے۔ اس لئے انہوں نے ایسی تدابیر سوچنی شروع کیں جن سے ان کے ہاتھ میں آیا ہوا اقتدار چھیننے نہ پائے۔ اس سے معاشرہ میں دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ وہ جو دوسروں سے اپنا حکم منواتا تھا اور دوسرا وہ جو ان کا حکم مانتا تھا۔ بعض اوقات حکمراں طبقہ سے اس کا اقتدار اور اختیار چھیننے کے لئے کوئی دوسرا فریق کھڑا ہو جاتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ محکوم طبقہ اپنے حکمراں طبقہ کے خلاف سرکشی پر آمادہ ہو جاتا۔ آپ غور کیجئے تو انسانیت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی داستان نظر آئے گی یعنی

1- حکمراں طبقہ کی کوشش کہ ان کے اقتدار و اختیار کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں

2- فریق مقابل کی خواہش کہ وہ اقتدار ان کے ہاتھ میں آ جائے۔
3- محکوم طبقہ کی سرکشی اور حکمراں طبقہ کی کوشش کہ انہیں دبا کر رکھا جائے۔
4- اور ارباب فکر و بصیرت کی یہ کاوش کہ ایسی کون سی تدبیر کی جائے جس سے معاشرہ میں سیاسی نظام بھی قائم رہے اور حاکم و محکوم میں کشمکش بھی نہ پیدا ہونے پائے۔

قبل اس کے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم نے اس مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے اہم ٹکڑوں کو سامنے لایا جائے۔ اور یہ بھی دیکھا جائے کہ ارباب فکر و بصیرت نے اس باب میں کیا کیا کوششیں اور کاوشیں کی ہیں۔

● ● ●

قبائلی نظام حکومت

شروع شروع میں انسان قبائلی زندگی بسر کرتا تھا یعنی ایک خاندان کے افراد مل جل کر رہتے تھے اسے ان کا قبیلہ کہا جاتا تھا قبیلہ کا بزرگ واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا اس لئے باہمی نزاعات کے فیصلے کرنے کا فریضہ اسی کا ذمہ تھا۔ اس کا فیصلہ ہر ایک کے لئے واجب الاتباع تھا۔ رفتہ رفتہ ان "بزرگان خاندان" کے دل میں بھی جذبہ حکومت نے انگڑائیاں لینی شروع کردیں اور وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے اور پائیدار بنانے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے"۔ یا (سعدی کے الفاظ میں) "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔ اسلاف کی پرستش (Ancestral Worship) اسی عقیدہ کی بڑھتی ہوئی شکل ہے۔

خداوندی اختیارات کا عقیدہ

انسان کی ابتدائی زندگی میں مذہبی پیشواؤں (Priests) کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ (اب بھی جہاں جہاں جہالت اور توہم پرستی کا دور دورہ ہے' مذہبی پیشواؤں کی پرستش ہوتی ہے)۔ وہ مافوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصور کئے جاتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا۔ اور ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کا

تصور تک بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا۔ ان مذہبی پیشواؤں نے عوام کی اس عقیدت مندی کا فائدہ اٹھایا اور اپنے دائرہ اقتدار کو پرستش گاہوں کی چار دیواری سے آگے بڑھا کر دنیاوی حکومت کے ایوانوں تک لے گئے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وہ خداوندی اختیارات (Divine Rights) کے حامل ہیں یعنی انہیں خدا نے حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے احکام خود خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت اور ان کی معصیت خدا کی معصیت ہے جس کی سزا اس دنیا میں عبرتناک عذاب ہے اور اگلی دنیا میں جہنم کی عقوبت' جب دوسرے حکمرانوں (بادشاہ وغیرہ) نے دیکھا کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرانے کا یہ طریقہ بڑا آسان اور نہایت کامیاب ہے ---- اس لئے کہ اس میں جسموں کی بجائے دلوں اور روحوں پر حکومت ہوتی ہے جس کے لئے نہ کسی پولیس کی ضرورت پڑتی ہے' نہ فوج کی حاجت ---- تو انہوں نے مذہبی پیشواؤں سے گٹھ جوڑ پیدا کیا۔ اس طرح راجہ ایشور کا اوتار اور بادشاہ ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار پا گیا اور وہ اپنے احکام و فرامین کو خدا کے احکام کی حیثیت سے منوانے لگا۔

تھیاکریسی

(انسانوں کے خود ساختہ) مذہب نے حکومت کی اس شکل کو بڑی تقویت پہنچائی ہے۔ اور ان "خدائی فوجداروں" کے ہاتھوں' نوع انسانی پر جسقدر مظالم' خدا کے نام پر ہوئے ہیں' شیطان بیچارے کے حصے میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں آیا ہو گا۔ اس نظام سیاست کو تھیاکریسی کہتے ہیں جسے عیسائیت نے خاص طور پر فروغ دیا تھا۔ وائی کونٹ سیموئیل' عیسائیت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

> اس نے بادشاہوں کے آسمانی حقوق کے عقیدہ کی تاکید کی۔ اس لیے یورپ کی تاریخ میں اس عقیدہ نے جس قدر تباہیاں پھیلائیں۔ ان کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ (Belief and Action P.39)

جس کی لاٹھی اس کی بھینس

یہ تو تھا مختلف تدابیر سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنا۔ اس کے برعکس' ایسا بھی ہوا کہ کسی قبیلہ یا قوم میں جو شخص سب سے زیادہ جسمانی قوت رکھتا تھا' یا جس نے سب سے زیادہ مادی قوت فراہم کرلی' اس نے باقیوں کو دبا کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ذرا غور کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ حکومت کا یہ نظریہ شروع سے آج تک مسلسل کار فرما چلا آرہا ہے۔ اسلوب و انداز اور اسباب و ذرائع میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن "اصول" ہر جگہ یہی کار فرما ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" انسان کے عہد جہالت و بربریت میں بھی یہی ہوتا تھا اور آج زمانہ تہذیب و تمدن میں بھی یہی ہو رہا ہے۔

نظریہ میثاق

جب ان ارباب فکر و نظر نے' جو حالات پر گہری نظر رکھتے تھے' یہ دیکھا کہ معاشرہ کے اجتماعی نظام کی ضرورت کس مقصد کے لئے پیش آئی تھی اور اس سے فائدہ کیا حاصل کیا جا رہا ہے' تو انہوں نے اس نظام کو (اپنی دانست کے مطابق) صحیح خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ افراد معاشرہ کو باہمی رضامندی سے یہ طے کرنا چاہئے کہ مملکت میں افراد کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے اور حکومت کے فرائض اور واجبات کیا؟ فریقین کے ان طے شدہ حقوق و واجبات کی توثیق ایک معاہدہ کی رو سے ہو جانی چاہئے۔ اس نظریہ کو (Theory of Contract) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ قدیم یونان سے چلا آ رہا تھا لیکن اٹھارویں صدی (عیسوی) میں' اسے یورپ میں ہابز (Hobbes)' لاک (Locke) اور روسو (Rousseau) نے خاص طور پر فروغ دیا۔ موجودہ ڈیماکریسی (جمہوریت) کی بنیاد اس نظریہ پر ہے یعنی "لوگوں کی باہمی رضامندی سے حکومت۔"

اقتدار اعلیٰ

نظام سیاست کے سلسلہ میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاملات کا آخری فیصلہ

کس کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ اسے اقتدار اعلیٰ یا (Sovereignty) کہتے ہیں --- جب زمام اقتدار مذہبی پیشواؤں یا بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی تو اس وقت یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (ہمارے زمانے میں' بادشاہوں کی جگہ ڈکٹیٹرں نے لے لی ہے اس لئے ان کی حکومت میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا) مذہبی پیشوا' بادشاہ یا ڈکٹیٹر' خود مقتدر اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن جب انداز حکومت جمہوری قرار پایا' تو اس وقت اس سوال نے اہمیت اختیار کر لی۔ روسو کے نزدیک "اقتدار اعلیٰ مملکت کے تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ لیکن لاک کا خیال میں یہ اقتدار افراد کی اکثریت کے پاس ہونا چاہئے۔ بنھم بھی لاک کا ہمنوا ہے۔ ڈیماکریسی نے اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔-- اس کے برعکس' مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ' اس طبقہ کو حاصل ہوتا ہے جس کے پاس وسائل پیداوار ہوں ---- نظام سرمایہ داری میں سرمایہ دار طبقہ کو ------ اشتراکی نظام میں مزدوروں کو ---- ہمارے دور میں جمہوری نظریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اکثر متمدن قومیں اس کی حامل ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' اس نظریہ کی بنیاد حسب ذیل مفروضات پر ہے۔

جمہوری نظام

(1) اس انداز حکومت میں حاکم و محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا' اس میں "عوام کی حکومت' عوام کے مفاد کی خاطر عوام ہی کی وساطت سے" کا اصول کار فرما ہوتا ہے۔ یعنی

(Government of the People, by the People for the People)

(2) عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

(3) کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی کثرت رائے ہوتا ہے۔

(4) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے ہوتے ہیں۔

یہ وہ نظام حکومت ہے جس پر انسان اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد پہنچا ہے اور مغربی مفکرین کے نزدیک اس نظام سے بہتر نظام کا تصور ناممکن ہے۔ اس نظام کو آیہ رحمت اور ضامن ہزار برکات و سعادت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تائید کرنے والوں کو حق و صداقت کے شاہد اور نوع انسان کے ہمدرد و بہی خواہ اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو انسانیت کا مجرم خیال کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مغرب کے عملی تجربہ نے اس نظام حکومت کو فی الواقع ایسا ثابت کیا ہے۔ یا وہاں کے مفکرین و مدبرین کسی اور نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ان مفکرین و مدبرین سے مراد ان ممالک کے ارباب فکر و سیاست ہیں جہاں جمہوری نظام قائم ہے۔

کچھ عرصہ ہوا' لندن یونیورسٹی کے پروفیسر فریڈ کوہن (Alfred Cohhan) نے ایک عمدہ کتاب لکھی تھی جس کا نام ہی (The Crisis of Civilisation) ہے وہ اس کتاب میں تہذیب مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ان میں سب سے بڑا سبب ان کا جمہوری نظام ہے (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اس میں "حاکم اور محکوم" میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ پروفیسر کوہن اس مفروضہ کے متعلق لکھتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی

> اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقہ کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں مملکت میں بدترین قسم کی آزادی اختیارات پیدا کر دیتا ہے۔ 1
>
> (ص 68)۔

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (A.C.Ewing) نے 1947ء میں ایک کتاب بہ عنوان (The Individual, The State and World Government) شائع کی تھی جس میں اس نے ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ بحث کے دوران میں وہ کہتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ نظام جمہوریت میں استبداد یا غصب حقوق کا خطرہ نہیں

1۔ اس مقالہ کے تمام اقتباسات میں نے اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا" سے لئے ہیں

ہو گا۔ کیونکہ لوگ خود اپنے اوپر آپ ظلم نہیں کریں گے۔ نہ اپنے حقوق خود غصب کریں گے۔ لیکن اگر روسو عصر حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظام جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (ص 116)

فرانسیسی مفکر رینی گوئن (Rene Guenn) اس باب میں لکھتا ہے۔

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے۔ جو کبھی نہ پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی ... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں ... عام رائے دہندگی (Universal Suffrage) کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے (اس اصول کی رو سے) سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(The Crisis of the Modern world P.106)

آگے بڑھنے سے پہلے، اس حقیقت کا ایک بار پھر سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ مفکرین جمہوری نظام کی جس خرابی پر اس شد ومد سے تنقید کر رہے ہیں اس نظریہ کا یہ مفروضہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ (یعنی قانون سازی کا لامحدود اور غیر مشروط حق) عوام کو حاصل ہے اور عوام کا یہ حق ان کے نمائندوں کی اکثریت کی وساطت سے بروئے

کار آتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس نظریہ کی رو سے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ملک کے نمائندگان کی اکثریت جو قانون بنائے وہ ملک کے تمام افراد کا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے اور ہر حال میں حق و صداقت پر مبنی۔ ان مفکرین کے نزدیک ' یہ اس نظریہ کی بنیادی کمزوری ہے۔ اور تباہی کا باعث۔ اس ضمن میں پروفیسر (H.L. Menckem) اپنی کتاب (Trfatise on Right and Wrong) میں لکھتا ہے۔

سب سے بڑی ناکامی

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا۔ جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جاسکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں بہت سی ایسی ' جو فی الواقع محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرات آزما تھیں۔ لیکن جب انہیں عملاً بروئے کار لانے کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اسکے سوا کچھ نہیں کہ یہ افراد مملکت کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور ارباب حکومت پبلک کے خدام ہیں۔ لیکن عملاً دیکھئے تو حکومت اپنا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب سمجھتی ہے ... اس باب میں مختلف اسالیب حکومت میں سب سے زیادہ ناکام جمہوری نظام رہا ہے۔ جمہوری نظام کے ارباب حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہئے۔ لیکن ! ان کا جذبہ محرکہ کبھی معقولیت پسندی نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ

جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے۔ اس کا ساتھ دیا جائے
چنانچہ اس ہتھکنڈے سے وہ ان لوگوں کی وساطت سے جو فی
الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں' لامحدود عرصہ تک برسر
اقتدار رہتے ہیں۔ (ص 234)

U.N.O کی تحقیق

1947ء میں اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ وہ جمہوری انداز حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین و مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے۔ اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ جس کا نام (Democracy in a World of Tension) ہے۔ اس کمیٹی نے سب سے پہلا یہ سوال پوچھا تھا کہ ڈیماکریسی کا مفہوم کیا ہے۔ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ لفظ بالکل مبہم ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے۔ کہ "دور حاضر میں لفظ جمہوریت سے زیادہ مہمل لفظ کوئی اور ہے ہی نہیں"۔ (صفحہ 460) اس کے بعد اس رپورٹ میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ

یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ
غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ
اکثریت کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اکثریت کے فیصلے کو
بدلوا دے۔ (صفحہ 504)

سابقہ صفحات میں ہم نے جمہوریت کے خلاف جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ دنیا میں اس وقت جو مختلف نظام حکومت رائج ہیں' ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی اور نظام جمہوریت کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ بالکل نہیں جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی فکر نے اپنی ساری تاریخ میں جو نظام سب سے

بہتر تجویز کیا تھا' تجربے نے اس کے متعلق بھی یہ بتایا ہے کہ وہ بڑا ہی ناکام رہا ہے۔ دنیا کے دیگر نظام ہائے سیاست کی طرح' اس نظام کی بنیادی خرابی بھی یہ ہے کہ اس میں حق اور باطل غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے مستقل (Permanent) خارجی (Objective) اور مطلق (Absolute) معیار کوئی نہیں۔ اس میں عوام کے نمائندگان کی اکثریت کا فیصلہ قانون بن جاتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک پر واجب ہوتی ہے۔

اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے کوئی مستقل' خارجی معیار نہ ہو اور قوم کے نمائندوں کی اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بن جائیں' تو اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ یہ سوال واقعی غور طلب ہے' بالخصوص اس لئے کہ ایک سیکولر حکومت اور قرآنی نظام مملکت میں بنیادی طور پر یہی مقام افتراق (Point of Departure) ہے سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ قوم کے عام افراد ہوں یا ان کے نمائندے۔ نمائندوں کی اکثریت ہو یا اقلیت۔ یہ ہوں گے تو بالآخر انسان ہی۔ اور جو کمزوری ایک انسان میں ہو سکتی ہے وہ انسانوں کے گروہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ باور کرنا ناممکن ہے' اور جو ایسا فرض کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو فریب دیتا ہے کہ نمائندوں کی اکثریت ان امیال و عواطف اور کشش و جاذبیت سے مبرئی ہو جائے گی جو ایک انسان کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے۔ لارڈ سنل (Lord Snell) کے الفاظ ہیں۔

> حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوں گی اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جائیں گی جو نوع انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی تشکیل کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوشمند نہیں ہو سکتے۔ (The New World -P.17)

الڈوس ہکسلے (Aldous Huxley) اس باب میں لکھتا ہے۔

تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گذرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو۔ اور ایسا باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ وہ آج نہیں ہو گا۔ یا آئندہ بھی ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔

(Science, Liberty and Peace-P. 41)

نیشنلزم کی تباہیاں

اس لئے اگر اکثریت کو بھی بلاحدود و قیود آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے ہاتھوں' دوسرے انسانوں کے حقوق کبھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ کچھ تو ہو گا اپنے ملک کے اندر رہنے والے انسانوں کے ساتھ۔ جہاں تک دوسرے ملکوں کے انسانوں کا تعلق ہے' انہیں انسان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس وقت دنیا کے باشندے مختلف قوموں (Nations) میں بٹے ہوئے ہیں نیشنلزم بحیثیت ایک سیاسی عقیدے کے دور حاضر کی پیداوار ہے۔ یا کم از کم یوں کہئے کہ اس زمانے میں اسے خاص طور پر فروغ حاصل ہوا ہے اور مغرب کو اس پر بڑا ناز ہے۔ لیکن نیشنلزم کے عملی تجربہ کے بعد خود مغرب کے مفکرین جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ اب راز کی بات نہیں رہی۔ پروفیسر کوبن جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے' اس باب میں لکھتا ہے۔

قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو پھر ان اقوام کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حق خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو پھر ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے حق خود مختاری کی مدعی ہوں۔

(The Crisis of Civilisation-P.166)

تاریخ قومیت کا عالم (Fredrick Hertz) اپنی کتاب (Nationality in

(History and Politics میں لکھتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) ایک انگریزی کے دل میں کسی فرانسیسی یا ہسپانوی یا اطالوی کا نام، نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کردیتا ہے۔ (صفحہ 328)

برٹرینڈ رسل، اپنی کتاب (The Hopes for a Changing World) میں لکھتا ہے۔

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوع انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

(جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ہمارے زمانے میں نیشنلزم کی حیثیت ایک سیاسی نظریہ ہی کی نہیں رہی۔ اس نے ایک عقیدے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آلڈوس ہکسلے کے الفاظ میں۔

نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے ایسا مذہب جو فساد اور تفریق انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدت انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔

(The Perennial Philosophy - P.P. 184 and 203)

حب الوطنی کا جذبہ

نیشنلزم کے مذہب بن جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت پرستی (Patriotism) سب سے بڑی نیکی اور جذبہ حب الوطنی سب سے بلند جوہر قرار پاچکا ہے۔ اس مذہب کا "کلمہ" یہ ہے کہ (My Country ---- Right Or Wrong) "میرا ملک حق پر ہو یا باطل پر میں بہرحال اس کا ساتھ دوں گا" Rumelin کے الفاظ میں

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہئے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز۔
>
> (Quoted by Murrayi in the Individual and the State-P. 216)

یہی وجہ ہے کہ وال پول نے کہا تھا کہ

> نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔
>
> (Quoted by Susan Stebbings inn Ideals and Illusions - P. 14)

اور لارڈ گرے کا عقیدہ تھا کہ "سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رو سے طے نہیں پایا کرتے۔" (ایضاً صفحہ 13) یہی وجہ ہے کہ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں 'اب دنیا میں

> پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امور مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدار' رحم دل اور قابل اعتماد ہیں'

ان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی
حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاہدہ کرنا ہو تو
وہاں وہ سب کچھ کر گذرنا کار ثواب ہے جسے وہ اپنی نجی زندگی
میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔

(Guide to the Philosophy of Morals and Politics - P. 730)

اسی حقیقت کو اٹلی کے مدبر (Cavour) نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ۔

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت
کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

(Foreigne Affairs year 1952)

●●●

ماحصل بحث

جو کچھ ہم نے سابقہ صفحات میں لکھا ہے' اسے مختصر الفاظ میں دہرانا چاہیں تو بات یوں سامنے آتی ہے کہ

1- مل جل کر رہنا ہے

2- مل جل کر رہنے سے ان کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور ٹکراؤ سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

3- اس مقصد کے لئے مختلف افراد کے مفاد میں ٹکراؤ نہ ہو اور اگر ٹکراؤ ہو تو اس سے جھگڑے پیدا نہ ہوں۔ سیاسی نظام کا تصور پیدا ہو۔

4- انسانی فکر نے آج تک جس قدر سیاسی نظام وضع کئے ہیں ان میں کوئی بھی اس مقصد کے لئے کامیاب ثابت نہیں ہوا۔

5- ان نظاموں میں آخری قومی جمہوریت ہے لیکن یہ نظام بھی بری طرح ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ اول تو اس سے ملک کے اندر مختلف پارٹیوں میں باہمی

کشمکش رہتی ہے۔ اور دوسرے مختلف ملکوں اور قوموں میں نفرت اور رقابت کے جذبات دنیا کو جہنم بنائے رکھے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انسانی فکر نے ان مشکلات کا بھی کوئی حل سوچا ہے۔ اور اگر سوچا ہے تو کیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے راستے میں کیا موانع ہیں؟

مفکرین مغرب کیسا نظام چاہتے ہیں

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ نظام جمہوریت کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں اقتدار اعلیٰ عوام کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے۔ اور عوام کے نمائندوں کی اکثریت کے فیصلے حرف آخر تصور کئے جاتے ہیں۔ اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر کوبن لکھتا ہے۔

> عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت سے قائم کی جائے گی۔ یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہہ دے وہ صحیح ہو' اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامند پر مبنی ہونا چاہئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے۔ نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی... فیصلہ وہی صحیح ہو سکا ہے جو درحقیقت صحیح ہو نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ منشائے عموی (General Will) ہمیشہ صحیح ہو گا ورنہ وہ منشائے عموی کہلا نہیں سکے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ (جب منشائے عموی' اس وقت منشائے عموی کہلا سکے گا جب وہ صحیح بات کہے تو) پھر کیوں نہ کہا جائے کہ جو بات اخلاقی معیار کے مطابق صحیح ہے وہی صداقت ہے (خواہ اسکی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھے) (صفحہ 76)

اخلاقی معیار

پروفیسر کوبن کا مطلب یہ ہے کہ کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار "اخلاقی بنیادیں" ہیں نہ کہ اکثریت کے فیصلے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب لاک نے جمہوریت کا نظریہ پیش کیا تھا تو اس کے پیش نظر بھی ایک "ابدی قانون" کا عملی نفاذ تھا جسے وہ "قانون فطرت" سے تعبیر کرتا تھا چنانچہ اس باب میں اس نے کہا تھا کہ

کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے۔ قانون فطرت وہ ابدی قانون ہے جو تمام انسانوں پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے۔ خواہ وہ قانون ساز ہوں یا قانون کے متبع۔

Mabbotb the State and the Citizen - P. 23)

(J.D.

قانون فطرت

لاک کے نزدیک قانون فطرت خدا کا بنایا ہوا ہے اور انسان اس کے ماتحت اس وقت رہا کرتے تھے جب وہ تہذیب و تمدن کے نام سے ناآشنا تھے اور "نیچر" کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اس وقت لوگ' عقل (Reason) سے کام لیتے تھے' جذبات سے نہیں۔ لیکن بعد میں جب لوگ جذبات کے پیچھے لگ گئے تو ان کی زندگی قانون فطرت کے مطابق نہ رہی۔ اب اسی قانون کی بازیابی اور اس کی عملی تنفید انسانی معاشرہ کا فریضہ ہے لیکن اتنا کچھ لکھنے کے بعد لاک یہ کہتاہے کہ یہ قانون اکثریت کی منشا سے مل سکتا ہے۔

لاک کی غلطی

آپ نے دیکھا کہ یہ اتنا بڑا مفکر کس طرح گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی نقطہ کے گرد ناکام چکر کاٹ رہا ہے؟ وہ انسانی فیصلوں کی غلطیوں اور مفاد پرستوں کی چیرہ دستیوں سے گھبرا کر پکار اٹھتا ہے کہ "کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے۔ اسے فطرت کے ابدی قانون کا پابند بھی رہنا ہو گا۔" اور جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ فطرت کا وہ ابدی قانون کہاں سے ملے گا تو اسے اس کے سوا کچھ اور نہیں سوجھتا کہ "یہ قانون اکثریت کے فیصلوں میں ملے گا" بارش سے بچنے کے لئے پرنالے کے نیچے پناہ لینا اسے ہی کہتے ہیں لیکن یہ لوگ ہیں بھی سچے۔

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

بہرحال ہم کہہ رہے تھے کہ اب مغرب کے مفکرین اس حقیقت کا احساس کر رہے ہیں کہ جمہوری نظام میں اکثریت کے فیصلوں کو بہرحال و بہرکیف صحیح سمجھنا غلط ہے۔ کسی فیصلہ کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے کسی خارجی معیار کی ضرورت ہے۔ لاک کے نزدیک یہ خارجی معیار قانون فطرت ضرور ہے۔ پروفیسر کوبن اسے "اخلاقی معیار" سے تعبیر کرتا ہے۔ مشہور اطالوی مدبر میزنی (Mazzeni) نے اس باب میں کہا تھا۔

خدا کا قانون

> اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدت عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے۔ کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو

خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو یا
زیادہ بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ
نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے
تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس
اور ناقابل تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو تو
ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ
سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں خدا کے علاوہ
جو حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے
خواہ اس کا نام بوناپارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان
میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے
گا۔ ... یاد رکھئے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے
مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشائے
خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے
اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی
نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(Quoted by Griffth in "Interpreters of Man" - P. 46)

یعنی میزنی کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار قوانین خداوندی ہونے چاہئیں جن کا نافذ کرنا حکومت کا فریضہ قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی مذہب کے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ لیکن یورپ میں جو مذہب (عیسائیت) رائج ہے پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں اس کی حالت یہ ہے کہ

قوانین خداوندی عیسائیت سے نہیں مل سکتے

عیسائیت کی رو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ
آنے والی دنیا ہے۔ اخروی دنیا خیر محض کی مظہر ہے۔ اس کے

برعکس یہ دنیا شرو فساد کی دنیا ہے۔ اس دنیا کی حیات ابدی ہے
یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔انسان کے لئے یہ دنیا
اگلی دنیا کے لئے تیاری کا مقام ہے۔ اس دنیا میں کوئی شے
با لکلیہ خیر اور طیب نہیں۔ یہاں جو کچھ نظر آتا ہے اسی
صورت میں اچھا ہے جبکہ وہ ان نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بن
سکے جس کا وعدہ اگلی دنیا میں کیا گیا ہے۔

(Guide to the Philosophy of Morals and Politics - P.127)

ہسپانوی پروفیسر (Dr. Falta De Gracia) اس باب میں لکھتا ہے۔

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح
ذہنی دیانت کا یہ اس کے تصور اخلاق سے یکسر باہر کی چیز ہے۔
عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح
یکسر بے حس ہے۔

(Quoted by Brifault in the Making of Humanity - P.334)

مشہور مفکر پروفیسر وہائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اسے اگر موجودہ
معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا
کچھ نہیں ہوگا۔ (Adventures of Idies - P.18)

انہی حقائق کے پیش نظر تہذیب کا مشہور (امریکی) مورخ (Dorsey) اپنی
کتاب (Civilisation) میں لکھتا ہے۔

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا
مذہب ہے وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعتراف شکست کرتے
ہیں یہاں کوئی شے قابل اطمینان نہیں۔ "اطمینان کی آرزو
باطل اور باطل آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔" یہ انداز نگاہ
صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے

انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (صفحہ 446)

منشور حقوق انسانیت

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مذہب سے کبھی وہ خدائی قوانین مل نہیں سکتے تھے جنہیں میزبی نے صحیح اور غلط کا ناقابل تغیر معیار قرار دیا تھا۔ اب یورپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کہ وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کسی اور دروازے پر دستک دے۔ یہ دروازہ مجلس اقوام متحدہ (U.N.O) کا تھا جس نے "انسانیت کے بنیادی حقوق" کے متعلق، تحقیق و تعین کے لئے ایک کمیشن بٹھایا اور اس کمیشن کی سفارشات کے مطابق 1948ء میں "منشور حقوق انسانیت" (Declaration of Human Rights) شائع کیا۔ اس میں ان حقوق کی فہرست دی گئی جو اقوام متحدہ کے نزدیک ہر حکومت میں ہر فرد انسانیہ کو حاصل ہونے چاہئیں۔اقوام متحدہ کے اس کارنامے کو عصر حاضر کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے دنیا کے ستائے ہوئے انسان کی ڈھارس بندھ سکتی تھی کہ اسے کسی طرح کچھ حقوق کی مستقل ضمانت تو ملی۔ لیکن اس کی یہ توقع بھی غلط نکلی ابھی مذکورہ صدر منشور زیر ترتیب ہی تھا کہ (UNESCO) (یعنی انجمن اقوام متحدہ ہی کے ایک ادارہ) نے دنیا کے مشہور ارباب فکر و نظر کے پاس ایک سوالنامہ بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آراء سے مطلع کریں۔ ان کے جوابات مسٹر (Jacques Maritain) کے تعارف کے ساتھ ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کئے گئے تھے۔ ان حقوق کی حیثیت کے متعلق سب سے پہلے خود مسٹر میری تین لکھتے ہیں۔

یہ حقوق بھی غیر متبدل نہیں

یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق، انسانی حقوق ہیں۔ اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابل ترمیم و تبدیل قرار دیا جائے۔ (صفحہ 15)

اس کے بعد ماڈرن کوارٹرلی لندن کا ایڈیٹر (Jhon Lewis) اپنے مقالہ کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے۔

> اس حقیقت کو اب ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حقوق انسانی کے متعلق یہ تصور کہ یہ حقوق مطلق ہیں اور فطرت انسانی کے اندر مضمر ہوتے ہیں اور انکی ابتداء اس زمانے سے ہوتی ہے جب انسان نے ہنوز معاشرہ کی طرح بھی نہیں ڈالی تھی ایک فسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (صفحہ 51)

شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسرGerard لکھتا ہے۔

> انسانی حقوق صرف اس کوشش کا نام ہیں کہ انسان اور اس کے معاشرے کے باہمی تعلقات کو متعین کر دیا جائے۔ یہ حقوق نہ تو مطلق ہوتے ہیں نہ ایسے کہ انہیں ہمیشہ ناقابل تغیر و تبدل قرار دیا جائے۔ (صفحہ 20)

یعنی جو کچھ اتنی کاوشوں اور کوششوں کے بعد انسان کو ملا' اس کے متعلق بھی اسے اطمینان نہیں کہ اسے وہ مستقل طور پر ملتا رہے گا اور اس میں کسی قسم کا تغیرو تبدل نہیں ہو گا۔ حقوق کے تحفظ کے متعلق مسٹرMaritain نے لکھا ہے۔

> انسانیت کے حقوق کی تعریف نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے حقوق انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو فلسفہ زندگی کہتے ہیں۔ (صفحہ 17)

اسی حقیقت کو پروفیسر جوڈ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

مستقل اقدار کی تلاش

> اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل

کر سکے۔ بنابریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے
کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے
مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی
ایک پیمانہ ہے۔

(Guide to the Philosophy of Morals and Politics - P. 806)

یعنی بات سمٹ سمٹا کر یہاں پہنچی کہ انسانی معاشرہ کی اس مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں کے باہمی معاملات مستقل اقدار کے مطابق طے ہوں اور یہی اقدار غلط اور صحیح قرار پائیں۔ یہ ہے وہ آخری منزل جس تک انسان اپنے ہزاروں سال کے ناکام تجارب کے بعد پہنچا ہے۔ لیکن اس منزل میں پہنچ کر بھی انسان ششدر و حیران کھڑا ہے کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ مستقل اقدار ملیں گی کہاں سے؟ وہ اپنے ذہن سے کچھ اقدار متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایک کی تردید دوسرا کر دیتا ہے۔

انسان کو اس مقام پر چھوڑ کر اب دیکھئے کہ خدا اس باب میں کیا کہتا ہے۔

● ● ●

باب دوم ------ خدا نے کیا کہا؟

انسان کیسا واقع ہوا ہے

قرآن کریم اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اگر انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی تمدنی زندگی ناممکن ہو جائے' اس لئے کہ انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ **وَ کَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا**" (18:54) یہ بڑا بے صبرا ہے **اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا**" (70:19) تنگ نظر ہے **وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا**" (17:100) جلد باز ہے **كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا** (17:11) مال و دولت

کی محبت میں بڑا متشدد ہے **وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ** (100:8) چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی دولت اسی کے پاس سمٹ کر آ جائے **وَ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا** (89:20) وہ دولت سمیٹتا چلا جائے اور پھر اسے گرہ میں باندھ کر رکھ لے۔ **وَ جَمَعَ فَاَوْعٰی** (70:19) اور اسے اس طرح روک کر بیٹھ جائے کہ یہ کسی اور تک نہ پہنچنے پائے **وَ اِذَا مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا** (70:21) واضح رہے کہ جب قرآن انسان کے متعلق یہ کچھ کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہ نہیں کہ انسان کی فطرت بد واقع ہوئی ہے قطعاً نہیں۔ انسان کی فطرت کوئی نہیں یہ سادہ لوح ۔ا کر آتا ہے اصل یہ ہے کہ تحفظ خویش

انسان بد فطرت نہیں

(Preservation of Self) ہر ذی حیات کا طبعی جذبہ ہے۔ ہر جاندار زندہ اور باقی رہنے کے لئے انتہائی جدوجہد کرتا ہے۔ انسان کے علاوہ جتنے ذی حیات ہیں فطرت نے انکی جدوجہد کا دائرہ خود محدود کر دیا ہے اسے ان کی جبلت (Instinct) کہتے ہیں کسی جاندار کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے اس دائرہ سے باہر نکل سکے۔ اس لئے حیوانات کی دنیا میں فساد انگیزی نہیں ہوتی۔ لیکن انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے وہ اپنے جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں --- انفرادی بھی اور اجتماعی بھی ---- جنہیں نپٹانے کے لئے نظام سیاست کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

کسی انسان کو حکومت کا حق نہیں

سابقہ باب میں ہم نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں کے سپرد جھگڑے نپٹانے کا کام کیا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو حاکم سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو محکوم' اس کے بعد اقتدار کی لذت انہیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی حکومت کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جائیں۔ اور ایسے اقدامات کریں جن سے حکومت ان کے ہاتھوں سے کبھی چھننے نہ پائے۔ قرآن نے ایک انسان پر دوسرے انسان کی حکومت کے تصور کو

باطل قرار دینے کے لئے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ **وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ** (17:70) "ہم نے تمام فرزندان آدم کو (یکساں طور پر) واجب التکریم پیدا کیا ہے" اس لئے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو حاکم اور دوسروں کو محکوم سمجھے اور اس طرح اوروں سے اپنا حکم منوائے **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (3:78) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین اور فیصلہ کرنے کی قوت اور نبوت (تک) بھی عطا کر دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم بن جاؤ..." للذا پہلی بات یہ ہے کہ قرآن' انسانوں کو حق حکومت دیتا ہی نہیں خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہوں؟ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ نظام حکومت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کی ضرورت سمجھتا ہے ---- بلکہ اسے لازمی قرار دیتا ہے ---- لیکن کہتا یہ ہے کہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ **اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ** حکومت صرف اللہ کی ہو سکتی ہے۔ **اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ** اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ **ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ** یہی نظام زندگی سیدھا اور متوازن ہے **وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ** (12:40) لیکن انسانوں کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی" خدا اپنے اس حق حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ **لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا**" (18:26)

خدا کی حکومت کتاب اللہ کی رو سے

لیکن خدا تو ایک مجرد حقیقت (Abstract Reality) ہے اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں نہ اس کی آواز سن سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے معاملات کے فیصلے اس سے کس طرح کرا سکتے ہیں؟ ہم اس کی محکومیت کس طرح اختیار کر سکتے ہیں؟ اس کے لئے اس نے بتا دیا کہ یہ فیصلے اس ضابطہ قوانین (کتاب اللہ) کی رو سے کئے جائیں گے جسے اس نے رسول ﷺ پر نازل کیا تھا۔ اس ضمن میں خود نبی اکرم ﷺ کی زبان سے کہلوا دیا کہ .

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ... (6:115)

کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم چاہوں حالانکہ اس نے ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

لہذا خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت کی جائے جنہیں اس نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے ان قوانین کے علاوہ اور کسی کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ اس کے متعلق خود خدا نے کہہ دیا کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (7:3)

تم صرف اسکا اتباع کرو جو تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اور اس کے سوا کسی سرپرست کا اتباع مت کرو۔ (لیکن) تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

زندہ اتھارٹی

لیکن کتاب کے اندر لکھے ہوئے قوانین محض نظری (Theoretical) حیثیت رکھتے ہیں اور متنازعہ فیہ امور میں کبھی فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک انہیں عملاً نافذ کرنے والی کوئی اتھارٹی موجود نہ ہو۔ قرآن نے سب سے پہلے خود رسول ﷺ کو ایسی اتھارٹی قرار دیا (اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی موجودگی میں کوئی اور اتھارٹی ہو نہیں سکتی تھی) اور آپ ﷺ کی اطاعت کو خود خدا کی اطاعت قرار دے دیا۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اور اس نظام کی اہمیت کو ان الفاظ میں اجاگر کر دیا گیا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا

قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا" (4:65)

تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں (اے رسول) تجھے اپنا ثالث مقرر نہ کریں اور پھر تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں بلکہ اسے اپنے دل کی پوری رضامندی سے قبول کر لیں۔

ایک طرف جماعت مومنین (یعنی مملکت اسلامی کے افراد) سے یہ کہا اور دوسری طرف رسول ﷺ (یعنی فیصلے دینے والی اتھارٹی سے تاکید کر دی کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ انکے درمیان کتاب اللہ کے فیصلے کر وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (5:48) جب حق تیرے پاس آچکا ہے تو ان لوگوں کے خیالات کی پیروی مت کر

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن نے جو نظام سیاست متعین کیا ہے' اس کی رو سے حکومت کی مرکزی اتھارٹی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ

1- وہ متنازعہ فیہ امور میں لوگوں سے اپنا حکم منوائے یا

2- ان قوانین کے خلاف فیصلہ دے جو کتاب اللہ میں مذکور ہوں۔

بالفاظ دیگر اس اتھارٹی کا کام قوانین سازی نہیں بلکہ قوانین خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) قانون سازی کے آخری اختیار کو کہتے ہیں' تو قرآنی نظام سیاست میں اس قسم کا اقتدار نہ عوام کے منشاء (General will of the People) کو حاصل ہوتا ہے نہ ہی کسی خاص فرد کو یہ حق صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کی عملی مظہر اس کی کتاب ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس نظام میں کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) بھی حاصل نہیں ہوتے۔ اس میں سب سے بڑی اتھارٹی بھی قوانین خداوندی کی اطاعت کرتی ہے خدا کے نام پر اپنا حکم نہیں چلاتی۔ چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق ارشاد ہے کہ وَاتَّبِعْ مَا يُوحٰى اِلَيْكَ (10:109)

"جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کی پیروی کر..."۔ خدائی اختیارات کا تصور قرآنی نظام سے کس قدر دور ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب رسول ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو کسی نے انہیں خلیفتہ اللہ کہہ کر پکارا اس پر آپ نے اسے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ میں خلیفتہ اللہ نہیں خلیفتہ الرسول ہوں اور خود رسول ﷺ نے بھی کبھی اپنے آپ کو خلیفتہ اللہ نہیں کہا۔ اسلامی حکومت قوانین خداوندی کو عملاً نافذ کرنے والی اور بندوں کے متعلق جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں انہیں پورا کرنے والی ہوتی ہے۔ خدا کی قائمقام نہیں ہوتی۔ خدا کی قائمقامی کا تصور تھیاکریسی کا پیدا کردہ ہے جو قرآن کی رو سے باطل ہے۔

●●●

غیر متبدل اصول

چونکہ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے تمام نوع انسان کا ضابطہ حیات قرار دے دیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں (بجز چند مستثنیات) صرف اصولی قوانین دیئے گئے ہیں انکی جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔ ان اصولوں کے متعلق کہہ دیا کہ یہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (6:116) "تیرے رب کی بات عدل اور سچائی کی حیثیت سے مکمل ہو گئی اس کی باتوں (قوانین) کو کوئی بدلنے والا نہیں (اس لئے کہ یہ قوانین معاذ اللہ کسی اندھی قوت یا بے خبر انسان کے بنائے ہوئے نہیں۔ یہ اس کے متعین کردہ ہیں جو) سب کچھ سننے والا اور ہر بات کا جاننے والا ہے۔ انہی "کلمات اللہ" (قوانین خداوندی) کو غیر متبدل اصول (Un Alterable principles) یا مستقل اقدار (Permanent Values) کہتے ہیں۔ ان میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا ----- کسی پارٹی کی اکیاون آراء تو ایک طرف پوری نوع انسانی کی سو فیصدی آراء بھی ان میں کسی قسم

کی کمی بیشی یا ردوبدل نہیں کر سکتیں۔ انہی غیر متبدل اصولوں کو حدود اللہ کہا جاتا ہے۔ اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حدود (Lines Boundary) کے اندر رہتے ہوئے افراد مملکت کے مشورے سے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام مرتب کرے۔ یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے لئے رسول ﷺ سے کہا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (3:158)

مشاورتی نظام

ان معاملات میں لوگوں سے مشورہ کیا کر" قرآن اس مشاورت کی کوئی خاص شکل تجویز نہیں کرتا۔ اس کے لئے اسلامی مملکت اپنے زمانے کے تقاضے اور اپنے حالات کے مطابق جس قسم کا انتظام مناسب سمجھے تجویز کر لے قرآن کا مقصد صرف مشاورت سے ہے مشاورتی مشینری سے نہیں اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی نظام سیاست میں قوانین سازی کے اختیارات قرآن میں بیان کردہ غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر محدود ہوں گے۔ یہ چار دیواری غیر متغیر رہے گی اور اس کے اندر امت کو اختیار ہو گا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اپنے لئے خود جزئیات متعین کرے۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس نظام میں نہ تو انسانوں کو ایسے غیر محدود اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ اپنی من مانی کر سکیں۔ اور نہ ہی ان کی آزادی کو اس طرح سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ اپنے معاملات کے متعلق کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ اس نظام میں امت کی حیثیت فٹ بال کے میدان میں ٹیم کی سی ہوتی ہے کہ وہ میدان کی چار دیواری (Boundary Lines) کے اندر رہتے ہوئے پوری آزادی کے ساتھ کھیل کھیلیں اور باہمی تعاون سے زندگی کے بال کو اس کے گول (نصب العین) تک لے جائیں۔ یہ ہے قرآنی جمہوریت کا صحیح تصور۔

رسول ﷺ کی وفات کے بعد

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ یہ نظام سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ نے متشکل فرمایا لیکن چونکہ یہ کوئی عارضی نظام نہیں تھا بلکہ اسے تمام نوع انسان

کے لئے ہمیشہ کے لئے تجویز کیا گیا تھا اس لئے قرآن نے اس کی صراحت کر دی کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے ساتھ ختم نہیں ہو جائے گا سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ (3:143)

محمد بجز این نیست کہ اللہ کا پیغامبر ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے پیغامبر ہو گذرے ہیں سو اگر یہ (کل کو) وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم پھر اپنی قدیمی روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟

چنانچہ امت سے کہہ دیا گیا کہ تم نے رسول ﷺ کی وفات کے بعد' اس نظام کو اسی طرح آگے بڑھاتے چلے جانا یعنی قرآن کی متعین کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے جزئیات کا تعین کرتے ہوئے اسی نظام کی حامل امت کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اسلامی جمہوریت

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) ان کا نظام حکومت باہمی مشورہ سے طے پاتا ہے اسی کا نام اسلامی جمہوریت ہے۔ اس جمہوریت میں

(i) نہ تو مغربی ڈیماکریسی کے مطلق اختیارات ہیں جس میں کوئی اصول غیر متغیر اور کوئی قدر مستقل نہیں اس میں برسراقتدار پارٹی کی اکثرت جو قوانین چاہے بنائے جب جی چاہے ان میں ردوبدل کر دے۔ اور جس وقت چاہے انہیں منسوخ کر دے۔

(ii) نہ ہی اس میں ملوکیت یا ڈکٹیٹرشپ ہے کہ ایک فرد قوت کے زور پر ہر ایک سے اپنا حکم منواتا چلا جائے۔

(iii) نہ ہی اس میں تھیاکریسی ہے کہ کسی فرد یا جماعت کو خدائی اختیارات کا حامل سمجھا جائے اس میں مذہبی پیشواؤں کا وجود ہی نہیں ہوتا اور

(iv) نہ ہی اس میں یہودی شریعت کی سی جکڑ بندی ہے کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کے لئے بھی غیر متبدل ابدی قانون موجود ہو اور اس

"لوہے کے جوتے" سے پاؤں باہر نکالا ہی نہ جا سکے۔

مستقل ضمانت

اس نظام سیاست میں ہر فرد انسانیہ کو ایسے حقوق حاصل ہوتے ہیں جنہیں کوئی تبدیل یا منسوخ نہیں کر سکتا حکومتیں قائم ہوتی رہیں اور بدلتی رہیں۔ افراد آتے رہیں اور جاتے رہیں لیکن اس مملکت میں بسنے والے شہریوں کو (خواہ غیر مسلم ہوں یا مسلم) جو حقوق خدا کی طرف سے مل چکے ہیں' ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہو سکتا کتنی بڑی ہے یہ ضمانت جو کسی مملکت میں افراد انسانیہ کو حاصل ہو اور وہ کتنا بڑا ہے وہ اطمینان جو اس ضمانت سے میسر آئے۔ سب سے بڑا اطمینان یہ کہ اس میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہو گا۔ اس کے لئے اس مملکت کا ہر شہری ارباب بست و کشاد کی طرف سے بار بار یہ اعلان سنے گا کہ

کلمہ شہادت کے معنی

اَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ

میں اس کی شہادت دیتا ہوں۔ میں دنیا کو پکار کر سنائے دیتا ہوں کہ دنیا میں خدا کے علاوہ کوئی صاحب اقتدار نہیں اس کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ کسی انسان سے اپنا حکم منوائے یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے اس میں کوئی شریک نہیں۔

اس میں اگر کوئی شریک ہو سکتا تھا تو خدا کا رسول ہو سکتا تھا جس سے بلند ترین ہستی کا تصور بھی ذہن انسانی میں نہیں آ سکتا لیکن

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ

میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں دنیا کو پکار کر سنائے دیتا ہوں کہ محمد ﷺ بھی خدا کا عبد (بندہ محکوم) اور اس کا پیغامبر ہے۔

اور جب دنیائے انسانیت کی بلند ترین ہستی کی یہ پوزیشن ہے تو کسی دوسرے انسان کو حق کب حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کو اپنا محکوم بنائے نہ رسول ﷺ نے کسی انسان کو اپنا محکوم بنایا نہ ہم کسی انسان کو اپنا محکوم بنا سکتے ہیں حضور ﷺ نے خود بھی احکام خداوندی کی اطاعت کی دوسروں سے بھی انہی احکام کی اطاعت کرائی۔ آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کے اتباع میں ہمارا فریضہ بھی یہی ہے کہ ہم خدا کے قوانین کی خود بھی اطاعت کریں اور دوسروں سے بھی انہی احکام کی اطاعت کرائیں۔

لوگ اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ اسلامک آئیڈیالوجی کیا ہے ایک فقرہ میں اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کی آئیڈیالوجی ہے اس کا کلمہ طیبہ یعنی اس امر کا اعلان کہ اطاعت و محکومیت صرف قوانین خداوندی کی ہے اور کسی کی نہیں۔

وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:164)

اس مقام پر یقیناً" آپ کے دل میں یہ آرزو پیدا ہو گی کہ ان اصولوں کا تعارف کرایا جائے جنہیں قرآن غیر متبدل قرار دیتا ہے اور ان اقدار کو سامنے لایا جائے جنہیں وہ مستقل اور مطلق (Permanent and Absolute) ٹھہراتا ہے اور جن کے نفاذ کے لئے اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے۔ ان اقدار کی فہرست طویل ہے جسے ضمناً" پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں لیکن اس غرض کے لئے کہ ان اقدار کا کچھ نہ کچھ تصور (Idea) ذہن میں آ جائے ہم یہاں (تمثیلاً) دو چار کا ذکر کئے دیتے ہیں۔

پہلی مستقل قدر تکریم آدمیت

سب سے پہلی قدر تو یہی ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) جن کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ اس میں رنگ نسل زبان ملک قوم مذہب حسب نسب امارات افلاس وغیرہ کی کوئی تمیز نہیں۔ ہر انسان بہ حیثیت انسان عزت کا مستحق اور تعظیم کا سزاوار

ہے۔ اس اصول کے بنیادی قدر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی مملکت نہ کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے اور نہ معاشرہ میں ایسا نظریہ رائج ہونے دے سکتی ہے جس کی رو سے کوئی انسان (پیدائش یا پیشہ وغیرہ کی) اضافی نسبتوں سے شریف یا ذلیل تصور کیا جائے۔ معاشرہ میں عزت کے مدارج جو ہر ذاتی کے مطابق متعین ہوں گے (وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19)

دوسری مستقل قدر۔ عدل

تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب العزت سمجھنا۔ ہر ایک کے لئے اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج کا تعین کرنا۔ کسی کے حقوق و واجبات (Dues) کو سلب نہ کرنا اور تمام امور کے فیصلے قانون کے مطابق کرنا جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو عدل کہلاتا ہے یہ قرآن کی رو سے دوسری مستقل قدر ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ ... (16:90) "اللہ عدل کا حکم دیتا ہے"۔ اسلامی مملکت کا راستہ کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔

تیسری مستقل قدر۔ احسان

بعض اوقات (مثلاً کسی پیدائشی نقص یا حادثات کی وجہ سے) ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کی کسی استعداد میں مستقل قدر پر کمی واقع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ دیگر ہم عصر افراد سے پیچھے رہ جاتا ہے اس کی اس کمی کا پورا کرنا احسان کہلاتا ہے اس لئے قرآن نے جہاں عدل کا حکم دیا ہے وہاں احسان کو بھی ایک غیر متبدل اصول قرار دیا ہے۔ چنانچہ جو آیت پہلے درج کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ اللہ عدل کرنے والوں کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیتا ہے۔ احسان کے معنی ہیں حسن قائم رکھنا توازن برقرار رکھنا۔

چوتھی مستقل قدر۔ دشمن سے عدل

عدل کے متعلق قرآن نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ صرف "اپنوں" کے ساتھ ہی نہیں کیا جائے گا دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کیا جائے گا ارشاد ہے **وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭاِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى** (5:8) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو ہر حال میں عدل کرو۔ یہ روش تقویٰ سے زیادہ قریب ہے یہ بھی قرآن کی رو سے ایک مستقل قدر ہے۔

پانچویں مستقل قدر۔ اپنا بوجھ آپ اٹھاؤ

عدل کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری خود اٹھائے اور ہر شخص اپنے اعمال کے لئے خود جواب دہ ہو۔ اس کے لئے قرآن نے کہا **وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى** (6:165) "کوئی بڑا بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"۔ یہ قرآن کا بڑا جامع اصول ہے جس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبہ پر ہو سکتا ہے یہ بھی ایک مستقل قدر ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

چھٹی مستقل قدر۔ نظم و نسق میں ہر ایک شریک ہو گا

ہم پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ قرآن کی رو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے یہ بھی ایک غیر متبدل اصول ہے ہر ایک کو قانون کی اطاعت کرنی ہو گی لیکن کوئی بھی ایسا قانون وضع نہیں کیا جا سکے گا جو خدا کی مقرر کی ہوئی مستقل اقدار سے ٹکرائے۔

مستقل اقدار کے مطابق حکومت قائم کرنا کسی ایک فرد یا پارٹی کا کام نہیں ہو گا۔ اس میں پوری کی پوری امت شامل ہو گی اس مقصد کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ **كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** (3:109) "تم ایک بہترین قوم ہو جسے تمام نوع انسان کی بھلائی کے لئے باہر لایا گیا ہے تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم سب کو قانون خداوندی کے مطابق چلنے کا

حکم دو اور قانون کی خلاف ورزی سے روکو" اس سے دو باتیں واضح ہیں ایک تو یہ کہ اسلامی حکومت تمام افراد کی مشترکہ امانت ہو گی اور دوسرے یہ کہ اس امت کی ہستی کی وجہ جواز (Justification) for Existance) یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں نوع انسان کی بھلائی ہو۔

ساتویں مستقل قدر۔ امانات نااہلوں کے سپرد نہ کرو

حکومت چلانے کا فریضہ تو تمام امت کا مشترکہ ہو گا لیکن اس کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہو گا کہ امور نظم و نسق صرف ان لوگوں کے سپرد کئے جائیں جو ان کے اہل ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ... (4:58)
"اللہ تمہیں اس امر کا تاکیدی حکم دیتا ہے کہ تم امانات کو ان لوگوں کے سپرد کرو جو انکے اہل ہوں"۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔

آٹھویں مستقل قدر۔ رزق کی ذمہ داری

قرآن کی رو سے اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے اور انہیں اس کی ضمانت دے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6:152) "ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

یہ بھی ایک بنیادی حق ہے جو تمام افراد مملکت کو یکساں طور پر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مملکت میں بدنظمی یا بے انصافی کی وجہ سے ایک فرد بھی بھوکا رہ جائے تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

حب الوطنی کا جذبہ

(9) یہ ظاہر ہے کہ اس نظام سیاست کی ابتداء کسی ایک خطہ زمین سے ہو گی جس کی حفاظت، تمام افراد مملکت کا اولین فریضہ ہو گا۔ اس حد تک ملک کی خیر سگالی (Patriotism) ایک مستحسن جذبہ قرار پائے گا

عالمگیر انسانی برادری

لیکن قرآن کا منتہیٰ یہ ہے کہ اس نظام کو تمام عالم انسانیت تک پھیلا دیا جائے' اس لئے کہ اس کی رو سے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں --- كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) تمام انسان امت واحدہ ہیں --- اس کا مستقل اصول ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس نظام کو اس طرح پھیلایا جائے کہ نوع انسانی اس کے خوشگوار نتائج کو دیکھ کر خود بخود اسے اختیار کرتی چلی جائے۔ وہ اسے جبراً کسی سے نہیں منوانا چاہتا۔

لا اکراہ فی الدین

اس لئے کہ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (2:256) (دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کی جا سکتی) اس کی طرف سے پیش کردہ مستقل اصول ہے جو لوگ اس نظام زندگی کو اپناتے چلے جائیں گے' وہ ایک امت کے فرد بنتے جائیں گے۔ جو اس کے خلاف کوئی دوسرا نظام تجویز اور اختیار کریں گے۔ وہ دوسری قوم کے افراد ہوں گے۔

قومیت کی تشکیل آئیڈیالوجی کی رو سے

قرآن کی رو سے قومیت کی تشکیل کا یہ معیار (یعنی آئیڈیالوجی) بھی ایک مستقل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح وہ چاہتا ہے کہ تمام انسان رفتہ رفتہ ایک قانون کے تابع آکر وحدت انسانیت کی زندگی بسر کریں۔ انسانی ہیئت اجتماعیہ کی یہی وہ شکل ہے جسے عملی پیکر میں دیکھنے کے لئے مغرب کے مفکرین اور مدبرین اس قدر آرزو مند ہیں چنانچہ پروفیسر کوبن اپنی اس کتاب کے آخری باب میں (جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے) لکھتا ہے۔

> "دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آ رہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔" (صفحہ 225)

مسٹر Emery Reves جس نے The Anatomy of Peace کے عنوان سے ایک مختصر لیکن بڑی جامع اور فکر انگیز کتاب شائع کی ہے کہتا ہے۔

عالمگیر نظام

ہم انٹر نیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم' خواہ وہ انٹر نیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت ہے یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ (صفحہ 164)

مسٹر Reves دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

کھلے کھلے الفاظ میں' بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد' انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کرہ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح جمہوری انداز سے اس اقتدار واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے اسے ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہئے جن پر یہ اقتدار منتشکل ہو گا اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہئے تاکہ یہ مقصد خوں ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔ اگر اس مقصد کا حصول اسطرح ممکن نہ ہوا تو پھر تاریخ کا فولادی ہاتھ مجبور کر دے گا کہ ہم اور خونریزی کریں اور آج سے زیادہ مہلک آلات حرب و ضرب

وضع کریں تاکہ سب سے زیادہ طاقتور جماعت باقی دنیا کو
مغلوب کر کے وحدت اقتدار قائم کر لے۔ (صفحہ 233)

واحد اقتدار

جس "اقتدار واحد" کے لئے مسٹر Reves کا دل اس قدر مضطرب و بیقرار ہے (اور دنیا کے ہر دل درمند کو ایسا ہونا چاہئے) اس کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے " لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کے انقلاب آفریں پیغام کے ذریعہ کر دیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے' اس (کلمہ توحید) کے معنی ہی یہ ہیں کہ تمام نوع انسانی کو واحد اقتدار کے تابع زندگی بسر کرنی چاہئے۔ اور وہ "واحد اقتدار" کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کا نہیں بلکہ خدا کا ہو سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یہ کہہ کر سمجھایا تھا کہ بتاؤ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (12:39)- "کیا مختلف اقتدارات بہتر ہیں یا ایک خدا کا اقتدار جو بڑی قوتوں کا مالک ہے؟" قرآن کی رو سے توحید کے معنی ہی وحدت اقتدار کے ہیں۔ اور شرک سے مفہوم ہے متعدد اقتدارات۔ اسی کے لئے اس نے کہا تھا کہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ (12:40) "خدا نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو۔" اقتدار صرف اسی کا تسلیم کرو اس کا پیغام تمام نوع انسان کے نام تھا کسی خاص قوم ملک یا گروہ کے نام نہیں قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ ----- ان سے کہہ دو کہ اے نوع انسان! جو نظام زندگی میں لایا ہوں اگر تمہیں اس کے سچا ہونے میں کوئی شک ہے تو (میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم ضرور اسے اختیار کرو۔ لیکن)۔ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ---- میں تو ان کا اقتدار تسلیم نہیں کر سکتا جن کا اقتدار تم خدا کو چھوڑ کر اختیار کئے ہو۔ میں تو صرف اسی خدائے واحد کا اقتدار تسلیم کرتا ہوں جس کی قوتوں کا یہ عالم ہے کہ تمہاری موت و حیات تک بھی اس کے اقتدار کے تابع ہے ----- وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ---- مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں کے زمرے میں رہوں جو خدا کے اقتدار پر یقین محکم رکھتے ہیں ------ وَاَنْ

وَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (10:104-105)
---- اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ تو ہر طرف سے منہ موڑ کر' اسی نظام زندگی کو اپنا نصب العین بنا اور مختلف اقتدارات کو اختیار کر کے مشرکین میں سے مت ہو جا ---- یہی وہ وحدت اقتدار ہے جو اس عالمگیر نظام انسانی کی بنیاد بن سکتا ہے' جس کا تصور پروفیسر Harold Laski کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا جب اس نے کہا تھا کہ

> دنیا میں اس وقت انسانی حالت کا تقاضا یہی ہے کہ ایک عالمگیر نظام کی تشکیل کی جائے جس کے ارکین تمام دنیا کے افراد ہوں
>
> (Human Rights-P. 91)

اور جس کے متعلق مسٹر W.A. Gould نے اپنی کتاب Nature and Man, Time میں لکھا تھا کہ

> مجھے تسلیم ہے کہ "گھر اور وطن" کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ایک عالمگیر انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے...... ابھی تک اس عالمگیر نظام کا احساس کچھ زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا اس لئے اس کے متعلق زیادہ حسن ظن قبل ازوقت ہو گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کم و بیش ہر ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہاہے اس امر کی ضمانت ہے کہ کچھ وقت کے بعد یہ خیال عملی شکل اختیار کرلے گا۔
>
> (ص 284-283)

قرآن کا کہنا ہے کہ ایسا نظام آخرلامر دنیا میں قائم ہو کر رہے گا---- خوں

ریزی سے نہیں بلکہ ذہنی تبدیلی سے جو زمانے کے تقاضوں سے رفتہ رفتہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مسٹرReves کا یہ خیال غلط ہے کہ جدید قسم کے آلات حرب و ضرب سے کوئی ایک قوم باقی اقوام کو مغلوب کرکے' اپنا اقتدار واحد قائم کر لے گی۔ اب جو آلات حرب و ضرب ایجاد ہو رہے ہیں اگر انہیں جنگ میں استعمال کیا گیا تو نہ قوم غالب باقی رہے گی نہ قوم مغلوب۔" پوری کی پوری نوع انسان تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے وحدت انسانیت کا عالمگیر نظام جو خدا کے اقتدار واحد کی بنیادوں پر استوار ہو گا' انسان کی داخلی تبدیلی سے ظہور میں آئے گا۔ یہی قرآن کا بتایا ہوا طریق کار (Proscess) ہے۔ لیکن اس کا آغاز بہرحال کسی ایک خطہ زمین سے ہو گا۔ وہ خطہ زمین پاکستان کیوں نہ ہو؟

اگر ہم نے پاکستان میں قرآن کے سیاسی نظام کو رائج کر لیا۔ تو اس سے نہ صرف ہماری مشکلات ہی کا حل مل جائے گا بلکہ ساری دنیا کو اس جہنم سے نجات مل جائے گی جس میں وہ آج اس بری طرح سے گرفتار۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس ہم سے بھی پہلے مغرب کے مفکرین کے دلوں میں بیدار ہو رہا ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کا نامور مورخ) پروفیسر ٹوئن بی (A.J. Toynbes) اپنی کتاب 'Vest The World and the میں لکھتا ہے۔

> مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعث فوز و فلاح ہونا مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دوسرے اسلامی ممالک' نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے جا رہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ اسے پوچھنا چاہئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان بلالحاظ اختلاف نسل' رنگ' زبان' عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں' ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہو گا؟...... دوسری

> عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے۔ اس میں یورپ کے اندر کم و بیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا ہے کہ وہ اس کے تصورات حیات کو آنکھیں بند کئے اپنائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودت و اخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری تصور اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصور ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے۔ لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔
>
> (صفحہ 30-31)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ غیر مسلم مفکر و مورخ ہمیں کیا کہہ رہا ہے؟ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ ہم تو قومیت پرستی کے عذاب میں ماخوذ ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی (آسمانی) روشنی نہ تھی جو صحیح راستے کی طرف ہماری راہ نمائی کرتی' لیکن تمہارے پاس تو (تیرہ سو سال سے) ایک قندیل خداوندی روشن تھی جو زندگی کے ہر دوراہے پر تمہاری راہ نمائی کرنے کے لئے کافی تھی۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا کہ تم بھی ہم اندھوں کے پیچھے لگ کر جہنم کی طرف چل پڑے؟ تمہیں تو ہماری راہ نمائی کرنی چاہئے تھی اور بتانا چاہئے تھا کہ انسانیت کی نجات و سعادت' آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر عالمگیر برادری کی تشکیل میں ہے' نہ کہ رنگ' نسل' زبان' وطن کے اشتراک سے قومیت کے تصور پر! آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ملت کی تشکیل' ہمارے لئے کوئی نیا نظریہ نہیں۔ یہ تو دین کے ان اصولوں میں سے ہے جو خدا کی طرف سے اس زمانے سے ملنے شروع ہو گئے تھے جب انسان کو پہلے پہل وحی کی راہ نمائی کی ضرورت پڑی تھی یہی وہ تصور تھا جس کی رو سے حضرت نوحؑ کے بیٹے کے

متعلق کہہ دیا گیا تھا کہ وہ باپ کے "اہل" میں سے نہیں ہے۔ اسی کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد (اور ساری قوم سے) کہہ دیا تھا کہ ان میں اور ان میں بعد و مغائرت کی وسیع خلیج حائل رہے گی جب تک یہ خدائے واحد کی محکومی تسلیم نہیں کریں گے۔ اسی نظریہ کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کا شمار بے گانوں میں کیا گیا تھا۔ پھر آخرالامر اسی اصول کے مطابق مکہ کے رہنے ولے قریش' خود نبی اکرم ﷺ کے ہم قبیلہ (بنو ہاشم) بلکہ اپ ﷺ کے قریب ترین رشتہ دار (حقیقی چچا وغیرہ)' اشتراک رنگ' نسل' زبان' وطن کے باوجود' ایک الگ قوم کے افراد قرار دیئے گئے تھے اور حبش کے بلالؓ' روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ اپنی برادری کے اخوان لیکن آج اسی دین کے نام لیواؤں کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ کہیں نسل کی بنیادوں پر جداگانہ قومیت کی تشکیل ہو رہی ہے کہیں زبان کے اشتراک سے علیحدگی کے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ کہیں وطنیت کی رو سے قوم ترتیب پا رہی ہے۔ ہم یہ کچھ کر رہے ہیں اور غیر مسلم ہمیں متنبہ کر رہے ہیں کہ تمہاری یہ روش تمہیں تباہیوں کی طرف لے جائے گی۔ تم اپنے ہاں عالگیر برادری کے اسی تصور کو عام کرو جسے تمہارے دین نے انسانیت کی فوز و فلاح کے لئے تجویز کیا تھا!

ظاہر ہے کہ عالگیر برادری اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے جب تمام مسلم ممالک اپنے ہاں قرآنی نظام سیاست رائج کر لیں۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ امکان پاکستان میں ہے۔ اس لئے کہ دوسرے ممالک میں کوئی نہ کوئی نظام پہلے سے رائج ہے۔ لیکن پاکستان نے اپنے لئے کسی نظام کو تجویز کرنا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اس وقت ساری دنیا کی آنکھیں پاکستان کی طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ اسے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ

تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

خدا کرے کہ مملکت پاکستان دنیا کی اس حسین توقع کو پورا کر دکھائے جو اس

نے اس کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہے۔

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

(ماخوز طلوع اسلام مارچ 1960ء)